بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دو قومی نظریہ

(اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کی نگاہوں میں)

از علامہ غلام احمد پرویزؒ

ذیل کا مقالہ 'روزنامہ نوائے وقت کی 21 نومبر 1980ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ اسے پرویز صاحب کی نظر ثانی کے بعد' نوائے وقت کے شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔

☆ ☆ ☆

17 اکتوبر 1980ء کو نوائے وقت میں میرا مبسوط مقالہ شائع ہوا' جس کا عنوان تھا۔۔۔ "کیا قائدِ اعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے"۔ اِس میں ضمناً دو قومی نظریہ کا بھی ذکر آ گیا تھا' لیکن چونکہ میرے زیرِ نظر موضوع دوسرا تھا اِس لیے میں اِسے چھوتا

ہوا آگے بڑھ گیا تھا۔ اِس مقالہ کی اِشاعت کے بعد مجھے متعدد خطوط موصول ہوئے ہیں' جن میں کہا گیا ہے کہ جس طرح میں نے اسلامک سٹیٹ اور سیکولر سٹیٹ کے فرق کو نکھار اور اُبھار کر بیان کیا ہے اور اِس باب میں قائدِ اعظمؒ کے خیالات کو شرح وبسط کے ساتھ پیش کیا ہے۔ اِسی طرح ''دو قومی نظریہ'' کے متعلق بھی مجھے تفصیل سے لکھنا چاہیے اور اِس باب میں علامہ اقبالؒ اور قائدِ اعظمؒ کے نظریات اور مسلک کو وضاحت سے بیان کرنا چاہیے۔ یہ سطور اِسی مطالبہ کی تعمیل میں تحریر ہیں۔

جب اِس کرۂ ارض پر انسانوں نے پہلے پہل مل جل کر رہنا شروع کیا تو وہ (مختصر ہی سہی) لا محالہ ایک جماعت، ایک گروہ، ایک معاشرہ تھا جس میں کسی قسم کی تفریق اور تقسیم نہیں تھی۔ اِس کے بعد ان میں تفریق پیدا ہونی شروع ہوئی۔ قرآن کریم کے الفاظ میں:-

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلاَّ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُواْ (10:19)

ابتداء میں نوعِ انسان ایک ہی امت تھی۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہو گئے۔

ان اختلافات کو مٹا کر انسانوں کو پھر سے امتِ واحدہ بنانے کے لئے انبیاء کرامؑ کا سلسلہ شروع ہوا۔ ارشاد ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللّهُ النَّبِيِّينَ مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ وَأَنزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُواْ فِيهِ (2:213)

''نوعِ انسان شروع میں ایک ہی امت کے افراد تھے۔ پھر ان میں اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے مبشرین اور منذرین انبیاء کرام کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی نازل کیا تاکہ وہ اس کے ذریعہ ان کے اختلافات کو مٹا کر (انہیں پھر سے امتِ واحدہ بنا دیں۔)''

نوعِ انسان کی امتِ واحدہ' سب سے پہلے خاندانوں میں تقسیم ہوئی۔ خاندان بڑھے تو اس تفریق نے قبائل کی شکل اختیار کر لی۔ قبائل دامن دراز ہوئے تو نسلی امتیازات کی تفریق پیدا ہو گئی۔ اور اب اس دور میں' اس تقسیم نے قومیت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اس تفریق کے لئے کرۂ ارض پر لکیریں کھینچی گئیں اور ان سے مختلف ممالک وجود میں آ گئے اور ایک ملک کی چار دیواری کے اندر

بسنے والے انسان ایک قوم کے افراد قرار پا گئے۔ اس طرح خدا کی وسیع و عریض زمین مختلف ملکوں کی حدود میں بٹ گئی اور انسانوں کی عالمگیر برادری نے متعدد قوموں کی شکل اختیار کر لی۔ چنانچہ اب کوئی انسان محض انسان ہونے کی نسبت سے پہچانا نہیں جاتا۔ وہ متعارف ہوتا ہے وطن یا قوم کی نسبت سے۔ اس سے دنیا کس قدر عالمگیر جہنم کے عذاب میں مبتلا ہے اس کا اندازہ اس چیخ و پکار سے لگ سکتا ہے جو دنیا (بالخصوص مغرب کے دانش کدوں) سے مسلسل اٹھ رہی ہے (یہ بہر حال دوسرا موضوع ہے) آپ نے دیکھا کہ یہ تفریق، خون، رنگ، نسل، زبان، وطن کی بنیادوں پر پیدا ہوئی۔ حضراتِ انبیاء کرامؑ نے (وحی خداوندی کی رو سے) کہا کہ یہ معیارِ تفریق باطل ہے۔ حقیقی معیارِ تقسیم، فکر و نظر (آئیڈیالوجی) کی ہم آہنگی ہے۔ زندگی کا ایک تصور مستقل اقدارِ خداوندی کی رو سے متشکل ہوتا ہے۔ جو لوگ اس تصورِ حیات میں ہم آہنگ ہوں' وہ رنگ' نسل' زبان اور وطن کے اختلاف کے باوجود ایک برادری کے افراد ہیں۔ جو اس تصور کہ تسلیم نہ کریں وہ دوسری برادری کے افراد۔ قرآن کریم میں ہے۔

هُوَ الَّذِي خَلَقَكُمْ فَمِنكُمْ كَافِرٌ وَمِنكُم مُّؤْمِنٌ (64:2)

"خدا نے تم سب کو پیدا کیا۔ پھر تم میں سے ایک گروہ نے بلند انسانیت کی زندگی سے انکار کر دیا، دوسرے گروہ نے اسے تسلیم کر لیا۔"

اور یوں نوعِ انسان دو گروہوں میں بٹ گئی۔ بلند سطحِ زندگی سے انکار کرنے والوں کو اصطلاح میں کافر کہتے ہیں۔ حقیقی زندگی کے تسلیم کرنے والوں کو مومن۔ کافر کے معنی انکار کرنے والا ہیں اور مومن کے معنی مان لینے والا۔ قرآن کریم کی رو سے' تفریقِ انسانیت کا یہی معیار ہے جس کے مطابق دنیا میں دو قومیں بستی ہیں مومن اور کافر۔ یا مسلم اور غیر مسلم۔

حضرات انبیاء کرامؑ نے اس معیارِ تفریق کو محض نظری طور پر پیش نہیں کیا۔ اپنی زندگی میں اس پر عمل پیرا ہو کر دکھا بھی دیا۔ سلسلۂ وحی کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے کو جب ان کے زمانے میں' ان کی اپنی قوم میں' اس معیار کے مطابق تفریق پیدا ہوئی تو حضرت نوحؑ ایک طرف تھے اور ان کا حقیقی بیٹا دوسری طرف' کیونکہ وہ مبنی بر وحی نظریۂ حیات میں ان سے ہم آہنگ نہیں تھا۔ اسی طرح جب حضرت ابراھیم علیہ اسلام کے باپ نے اس صحیح روشِ زندگی کو اختیار کرنے سے انکار کر دیا تو آپ نے نہ صرف باپ سے بلکہ پوری قوم سے یہ کہہ کر قطع تعلق کر لیا کہ

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ (19:48)

"میں تم سے اور جنہیں تم خدا کے سوا پکارتے ہو سب سے الگ ہوتا ہوں۔"

اور اتنا ہی نہیں، بلکہ ان سے کہہ دیا کہ

إِنَّا بُرَاء مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ (60:4)

"ہم تم سے اور ان سے جن کی تم خدا کو چھوڑ کر عبودیت اختیار کئے ہو، سب سے یکسر بے تعلق ہیں۔" كَفَرْنَا بِكُمْ "ہم تم سے ہر رشتے کا انکار کرتے اور بیزاری کا اعلان کرتے ہیں۔" وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاء أَبَدًا (60:4) "تم میں اور ہم میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھلی کھلی عداوت اور نفرت رہے گی۔" "اگر تم چاہتے ہو کہ ہم سے تعلق پیدا کرو، اور یہ عداوت محبت سے اور یہ نفرت رفاقت میں بدل جائے تو اس کا ایک ہی طریق ہے، اور وہ یہ کہ تم بھی اس راستے کی سچائی پر یقین کر لو جو اللہ نے ہم سب کے لئے مقرر کیا ہے۔ حَتَّى تُؤْمِنُوا بِاللَّهِ وَحْدَهُ (60:4) اس لئے کہ اس عالگیر اصولِ زندگی کی رو سے اپنوں اور بیگانوں کا معیار، خون یا وطن کا رشتہ نہیں، معیار یہ ہے کہ فَمَن تَبِعَنِي فَإِنَّهُ مِنِّي (14:36) "جو شخص میرے پیچھے پیچھے چلتا ہے (وہ کسی قبیلہ کا فرد اور کسی وطن کا باشندہ ہو) وہ میرے اپنوں میں سے ہے" اور میرے "اپنے" جو کسی دوسری راہ پر چلتے ہیں وہ میرے غیر ہیں۔ یہی معیار تھا وہ معیار جس کے مطابق حضرت لوطؑ کی بیوی کے متعلق کہہ دیا گیا کہ وہ اپنوں میں سے نہیں بلکہ غیروں میں سے تھی اس لئے اس کا حشر انہی کے ساتھ ہوا (66:10-11) قومیت کی تقسیم و تفریق کا یہی معیار تھا جو نوعِ انسانی کی وسعتوں کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا آیا۔

قومِ رسولِ ہاشمیؐ

تا آنکہ دنیا کے سامنے وہ دور آ گیا جب وحی کی تکمیل ہو گئی اور اس کے مطابق نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں، ایک ایسی قوم کی تشکیل ہوئی جس نے ساری دنیا پر روزِ روشن کی طرح واضح کر دیا کہ قومیت کا صحیح معیار کیا ہے۔ اس تشکیلِ قومیت کے مطابق حبش کا بلال۔ فارس کا سلمان۔ اور روم کا صہیبؓ محمدِ عربیؐ کی "اپنی قوم" کے افراد تھے اور مکہ کا ابو جہل اور (حقیقی چچا) ابو لہب "غیر قوم" کے

افراد۔ قومیت کی اس تقسیم کا عملی مظاہرہ بدر کے میدان میں نکھر کر سامنے آ گیا جب آسمان کی آنکھ نے یہ نظارہ دیکھا کہ حضرت ابو بکرؓ ایک طرف اور ان کا بیٹا دوسری طرف۔ حضرت حذیفہؓ ادھر تھے تو ان کا باپ عتبہ دوسری طرف' حضرت عمرؓ اس طرف تھے تو ان کا ماموں اس طرف۔ حضرت علیؓ ادھر تھے تو ان کا بھائی عقیل ادھر۔ نہیں' اور آگے بڑھئے۔ ادھر خود محمدؐ تھے تو ان کے مدِّ مقابل آپؐ کے حقیقی چچا عباس اور داماد ابو العاص۔ یہ تھی وہ تقسیمِ انسانیت' جو وطن' رنگ' زبان' نسل' اور رشتہ داری کے تمام حدود و ثغور سے بلند ہو کر' خالص ایمان اور کفر کے معیار پر وجود میں آئی تھی۔ یہ تھی وہ امتِ محمدیہؐ۔ وہ ملتِ اسلامیہ۔ وہ جماعتِ مومنین جو دنیا کے مختلف حصوں کے ان انسانوں پر مشتمل تھی جب میں وجہ اشتراک صرف ایمان تھا۔ یہی تھی وہ تقسیم جس کے متعلق کہہ دیا کہ مومنین کی جماعت کے افراد بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ (8:72) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز ہیں۔" اور ان کے مقابلہ میں' نہ ماننے والوں (کفار) کی قوم بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاء بَعْضٍ (8:73) "ایک دوسرے کے دوست اور چارہ ساز"۔ اس کے بعد اس قومِ مومنین کو تاکید کر دی کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُواْ لاَ تَتَّخِذُواْ بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ (3:117)

"اے جماعتِ مومنین! تم اپنے سوا اور کسی کو اپنے رازوں میں شریک نہ کرو۔"

اس لئے کہ لاَ يَأْلُونَكُمْ خَبَالاً "یہ تمہاری تخریب میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھیں گے۔" وَدُّواْ مَا عَنِتُّمْ "ان کی دلی خواہش یہ ہے کہ تم کسی نہ کسی مصیبت میں الجھے رہو۔" قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاء مِنْ أَفْوَاهِهِمْ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ان کے بغض و عداوت کی بعض باتیں تو ان کے منہ پر آ جاتی ہیں۔ لیکن جو کچھ ان کے دلوں میں چھپا رہتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہے۔ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الآيَاتِ إِن كُنتُمْ تَعْقِلُونَ (3:117) "ہم نے تمہیں واضح طور پر امور سے آگاہ کر دیا ہے۔ اگر تم عقل و فکر سے کام لو گے (تو زندگی کے صحیح راستے پر چلتے جاؤ گے)" ان نہ ماننے والوں کی حالت یہ ہے کہ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ "اگر کوئی بات تمہاری بھلائی کی ہوتی ہے تو اس سے انہیں بہت رنج پہنچتا ہے" وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُواْ بِهَا (3:119) "اور اگر انہیں کچھ نقصان پہنچتا ہے تو یہ چیز ان کے لئے بڑی خوشی کا موجب ہوتی ہے۔"

یہ ہے قرآن کی تعلیم مسلم اور غیر مسلم کے باہمی تعلقات کی بابت۔ پھر چونکہ یہ قوم (مومنین) خانقاہ نشین راہبوں کی جماعت یا تارک الدنیا زاہدوں کا گروہ نہیں تھی، بلکہ وہ قوم تھی جس کے دین کے متمکن (Establish) ہونے کے لئے حکومت لاینفک تھی (دیکھئے 24:55) اس لئے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ 'تم نے اپنی حکومت میں تمام فیصلے احکامِ خداوندی کے مطابق کرنے ہیں۔ فَاحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنزَلَ اللّٰهُ (5:48) جو ایسا نہیں کرے گا وہ مومن نہیں کافر ہے (5:44) قرآن کے ان اصولوں کی روشنی میں تمہیں جو فروعی قوانین مرتب کرنے پڑیں انہیں آپس میں ایک دوسرے کے مشورے سے طے کیا کرو۔ وَأَمْرُهُمْ شُورَى بَيْنَهُمْ (42:38) ان میں کسی غیر کو شریک نہ کیا کرو۔ جو ان مستقل اقدار کی صداقت پر یقین ہی نہیں رکھتا وہ تمہارے امور مملکت میں شریک و دخیل کیسے ہو سکتا ہے؟ چنانچہ آپ کو نہ رسول اللہؐ کی مجلسِ شوریٰ میں کوئی غیر مومن دکھائی دے گا نہ خلفائے راشدینؓ کی پارلیمان میں کوئی غیر مسلم۔ ان کی حکومت خالصتاً جماعتِ مومنین پر مشتمل تھی اور غیر مسلم اس مملکت میں ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے رہتے تھے جن کی حفاظت کی ذمہ داری ان کے سر پر تھی۔ وہ "قومِ مسلم" کے افراد نہیں تھے۔

صدرِ اول کے بعد

اسلام کے صدرِ اول کے بعد، جب دین، مذہب میں بدل گیا تو اس کے دیگر مہماتِ اصول کی طرح، قومیت کا نظریہ بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا اور مسلمان بھی، دیگر قوموں کی طرح، نسل اور وطن کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ گئے۔ صدیوں سے ہماری یہی حالت چلی آ رہی تھی کہ ہم میں اقبالؒ جیسا مفکر پیدا ہو گیا جس نے اپنی قرآنی بصیرت کی رو سے (دین کی دیگر اساسات کی طرح) اس فراموش کردہ حقیقت کی بھی از سرِ نو یاددہانی کرائی کہ امتِ محمدیہؐ کا نسلوں اور وطنوں کی تفریق سے مختلف قوموں میں بٹ جانا، اسلام کی بنیادی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہ پوری امت، ایمان کے اشتراک کی بنا پر امتِ واحد ہے۔ فکرِ اقبالؒ کے عام ہونے کی وجہ سے آج ہمارے لئے یہ سمجھنا کہ اسلامی قومیت کا یہی معیار ہے، چنداں تعجب انگیز نہیں لیکن خود اقبالؒ کا اس قرآنی حقیقت تک پہنچنا بڑا تعجب انگیز تھا۔ وہ 1905ء میں (جب اس کی عمر تیس بتیس سال سے زیادہ نہ تھی) حصولِ تعلیم کے لئے یورپ گیا اور تین سال تک وہاں رہا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اقوامِ یورپ میں نیشنلزم کی مدح و ستائش کے غلغلے بلند ہو رہے تھے۔ دانایانِ مغرب اس

کئے جا رہے تھے۔ ان حالات میں ایک ایسے نوجوان طالبِ علم کو جو پہلے ہی سے نیشنلزم سے متاثر ذہن لے کر یورپ گیا ہو، متشدّد نیشنلسٹ ہو جانا چاہیے تھا۔ لیکن مورخ کی نگاہ یہ دیکھ کر محوِ حیرت رہ جاتی ہے کہ اس طالبِ علم کے قلب و نگاہ میں ایک عجیب انقلاب رونما ہوا۔ وہ گیا تھا تو یہ کہتے ہوئے کہ

ہندی ہیں ہم ' وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور واپس آیا تو یہ گاتا ہوا کہ

چین و عرب ہمارا' ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم ' وطن ہے سارا جہاں ہمارا

وہ گیا تھا تو یہ گنگناتا ہوا کہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

اور وہ واپس آیا تو یہ الاپتا ہوا کہ

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے!

وہ گیا تھا تو یہ سندیش دیتا ہوا کہ

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا
ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

اور آیا تو یہ اعلان کرتا ہوا کہ

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

چونکہ یہ نظریہ اسلامی نظامِ زندگی کی اصل اور بنیاد تھا، اس لئے علامہؒ نے اس کی تبلیغ کو اپنی زندگی کا مشن قرار دے لیا۔ وہ اسے کس شدّومد سے پیش کرتے تھے' اس کا اندازہ اس نظم سے لگایئے جو بانگِ درا میں ''وطنیت'' کے عنوان سے درج ہے اور اس میں وہ کہتے ہیں۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے
غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے ، تو مصطفویؐ ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے!
اے مصطفویؐ ! خاک میں اس بت کو ملا دے

اس نظریہ کی مخالفت

میں نے اپنے مقالہ (شائع شدہ نوائے وقت، بابت 17/ اکتوبر 1980ء) میں یہ بتایا تھا کہ جب قائدِ اعظم نے سیکولر سٹیٹ کے خلاف اسلامی مملکت کا نظریہ پیش کیا تو اس کی سب سے زیادہ مخالفت نیشنلسٹ علماء کی طرف سے ہوئی تھی۔ اسی طرح اقبالؒ کے پیش کردہ نظریۂ قومیت کی شدید ترین مخالفت بھی انہی کی طرف سے ہوئی۔ اس کا ٹیپ کا بند ان کی وہ بحث ہے جو (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ ہوئی۔

شروع 1938ء کی بات ہے۔ مولانا مرحوم نے دہلی کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ۔۔۔ ''قومیں اوطان سے بنتی ہیں' مذہب سے نہیں''۔۔۔ ہندوستان کے سب سے بڑے دارالعلوم، دیوبند، کے شیخ الحدیث کی طرف سے اس قسم کا اعلان 'کوئی ایسا حادثہ نہیں تھا جسے آسانی سے برداشت کیا جاسکتا۔ علامہ اقبالؒ اس زمانے میں یوں کہیئے کہ مرض الموت میں مبتلا تھے۔ جب انہوں نے اس خلافِ اسلام نعرہ کو سنا تو ان کے دلِ صد چاک سے ایک آہ اُبھری' جو ان الفاظ کی شکل میں فضا کو چیرتی ہوئی آس سوئے افلاک تک جا پہنچی کہ

عجم ہنوز نداند رموزِ دیں ورنہ
ز دیو بند حسین احمد ایں چہ بو العجبی است
سرود بر سرِ منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقامِ محمدِؐ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بو لہبی است

ان اشعار میں ''بمصطفیٰ برساں خویش را'' کے الفاظ گہرے غور و فکر کے متقاضی اور ایک عظیم حقیقت کے عکاس ہیں۔ دین خدا کی طرف سے ملتا ہے، لیکن امت کی تشکیل اس رسول کی نسبت سے ہوتی ہے جو اس دین کو انسانوں تک پہنچاتا اور اس کے مطابق ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے۔ اسی نسبت سے اسلام کے پیرو 'امتِ محمدیہ ؐ' کہلاتے ہیں۔ اگر قومیت کی اساس وطن یا نسل قرار پا جائے تو رسولؐ سے نسبت ختم ہو جائے اور جب رسولؐ سے نسبت منقطع ہو جائے تو پھر اسلام بھی باقی نہیں رہتا۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُواْ دِينَهُمْ وَكَانُواْ شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ (6:160)

جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر لیں اور اس طرح الگ الگ فرقے، پارٹیاں، قومیں بن جائیں، اے رسولؐ تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔

یعنی اگر قومیت کی اساس، اسلام کی طرف نسبت کی بجائے کوئی اور قرار دے لی جائے تو ایسے لوگوں کا رسولؐ سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر علامہ اقبالؒ نے کہا کہ وطن کو قومیت کی اساس قرار دینے سے رسول اللہؐ سے رشتہ منقطع ہو جاتا ہے۔ اگر تم مسلمان رہنا چاہتے ہو تو اپنی قومیت کی نسبت، وطن کے بجائے، حضور نبی اکرمؐ کی طرف کرو۔ بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔ اگر باو نرسیدی۔۔۔ اگر تم نے اپنی نسبت حضورؐ کی طرف نہ کی تو۔۔۔ تمام بو لہبی است۔۔۔ پھر دین باقی نہیں رہتا، بو لہبی رہ جاتی ہے جس میں قومیت کی نسبت وطن یا نسل کی طرف کی جاتی ہے۔ اس اصولی حقیقت کی وضاحت کرتے ہوئے علامہؒ نے کہا۔

> اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی قابلِ قدر اور اہم تھا تو رسول اللہؐ کے بعض اقارب، ہم نسلوں اور ہم قدموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی۔ کیوں نہ رسول اللہؐ نے اسلام کو ایک ہمہ گیر ملت سمجھ کر بلحاظِ قوم یا قومیت، ابوجہل اور ابولہب کو اپنائے رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے۔ بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیتِ وطنی قائم رکھی۔ محمدؐ (فداہ ابی وامی) کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے ایک قوم تھی اور آزاد تھی، لیکن جب

محمدؐ کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی رہ گئی۔ جو لوگ رسول اللہؐ کی متابعت میں آ گئے وہ خواہ ان کی قوم میں تھے یا دیگر اقوام سے، وہ سب امتِ مسلمہ یا ملتِ محمدیہؐ بن گئے۔ پہلے وہ ملک و نسب کے گرفتار تھے، اب "ملک و نسب" ان کا گرفتار ہو گیا۔

کسے کو پنجہ زد ملک و نسب را
نہ داند نکتۂ دینِ عرب را!
اگر قوم از وطن بودے، محمدؐ
نہ دادے دعوتِ دیں بو لہب را

حضور رسالت مآبؐ کے لئے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابو لہب یا ابو جہل یا کفارِ مکہ سے فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو، ہم اپنی خدا پرستی پر قائم رہتے ہیں۔ مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے، ایک وحدتِ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر حضورؐ (نعوذ باللہ) یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی، نبیٔ آخر الزماںؐ کی راہ نہ ہوتی۔

آپ نے غور فرمایا کہ علامہ اقبالؒ نے اپنے اس بیان میں اسلامی نظریۂ قومیت کو کس قدر اُبھار کر اور نکھار کر بیان کر دیا ہے۔ لیکن ابھی اس نظریہ کا ایک رُخ باقی ہے۔ جیسا کہ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں، دین تو خدا کی طرف سے ملتا ہے لیکن امت کی تشکیل اس نبی کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جس کی وساطت سے وہ دین ہم تک پہنچتا ہے۔ میں اس حقیقت کہ اس سے پہلے بھی متعدد بار واضح کر چکا ہوں، لیکن موضوع کی اہمیت کے پیشِ نظر، اِسے آج پھر دہرانا ضروری سمجھتا ہوں کہ امت کی یہ تشکیل اس رسول کی طرف نسبت سے ہوتی ہے جسے سلسلۂ انبیاء کرام کی آخری کڑی تسلیم کیا جائے۔ مثلاً ایک عیسائی، حضرت عیسیٰؑ کو اس سلسلہ کی آخری کڑی سمجھتا ہے، یعنی نبوت کو حضرت عیسیٰؑ کی ذات پر ختم قرار دیتا ہے، اس لئے وہ امتِ حضرتِ عیسیٰؑ کا فرد (یعنی عیسائی) کہلاتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰؑ کے بعد ایک اور نبی (یعنی محمد رسول اللہؐ) پر ایمان لے آتا ہے وہ امتِ عیسیٰؑ سے کٹ کر ایک

نئی امت (یعنی محمدیہؐ) کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ اسی اصول کی رو سے اگر کوئی شخص، محمد رسول اللہؐ کے بعد کسی اور نبی پر ایمان لاتا ہے تو وہ امت محمدیہؐ سے کٹ کر ایک نئی امت کا فرد قرار پا جاتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے بیان میں اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا کہ جس طرح رسول اللہؐ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرنے والے کا رشتہ امتِ محمدیہؐ سے کٹ جاتا ہے، اسی طرح وطن یا نسل کو قومیت کی اساس قرار دینے سے بھی امتِ محمدیہؐ کے ساتھ رشتہ باقی نہیں رہتا۔ انہوں نے کہا کہ

> حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریۂ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں "انکارِ خاتمیت" کا نظریہ۔ وطنیت کے حامی بالفاظِ دیگر یہ کہتے ہیں کہ امتِ مسلمہ کے لئے ضروری ہے کہ وقت کی مجبوریوں کے سامنے ہتھیار ڈال کر اپنی اس حیثیت کے علاوہ جس کو قانونِ الٰہی ابد الاباد تک متعین و متشکل کر چکا ہے، کوئی اور حیثیت بھی اختیار کرے۔ جس طرح قادیانی نظریہ، ایک جدید نبوت کی اختراع سے قادیانی افکار کو ایسی راہ پر ڈال دیتا ہے کہ اس کی انتہا نبوتِ محمدیہؐ کے کامل و اکمل ہونے سے انکار ہے۔ بعینہٖ اسی طرح وطنیت کا نظریہ بھی امتِ مسلمہ کی بنیادی سیاست کے کامل ہونے سے انکار کی راہ کھولتا ہے۔

آپ نے دیکھا کہ علامہ اقبالؒ نے کس طرح اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ وطن یا نسل کی بنیادوں پر قومیت کا تصور، ذاتِ رسالت مآبؐ سے اپنا رشتہ منقطع کر کے 'ایک جدید امت' یا نئے دین کو وجود میں لانے کے مرادف بن جاتا ہے۔

علامہ اقبالؒ کی یہ تنبیہہ اس قدر واضح تھی کہ اس کے بعد مولانا مدنی اور اس کے ساتھ دیگر نیشنلسٹ علماء کو نہ صرف اپنی غلطی کا اعتراف کر لینا چاہیے تھا بلکہ نیشنلزم کا مسلک بھی ترک کر دینا چاہیے تھا۔ لیکن اس کی بجائے مولانا مدنی نے اپنے دعویٰ کی مدافعت میں لمبا چوڑا بیان داغ دیا۔ اس کے جواب میں علامہ اقبالؒ نے وہ بیان شائع کیا جو "معرکۂ دین و وطن" کے نام سے مشہور ہے اور جو اسلامی قومیت کے مسئلہ پر ناقابلِ تردید حقائق کی تابندہ دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ ان کے اس معرکہ آراء' بیان کو یہاں درج کرایا جائے، لیکن عدم گنجائش اس سے مانع ہے۔۔۔ (ویسے میں اس موضوع پر طلوعِ اسلام میں مسلسل لکھتا چلا آ رہا ہوں)۔

(ضمناً) مولانا مدنی (مرحوم) کے متبعین میں سے بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ علامہ اقبالؒ کے اس بیان کے بعد، مولانا مدنی نے یہ وضاحت کر دی تھی کہ انہوں نے یہ نہیں کہا تھا کہ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ میں نے کہا تھا کہ آج کل قومیں، وطنیت کی بنا پر متشکل ہوتی ہیں اور علامہ اقبالؒ نے ان کی اس معذرت (باوضاحت) کو تسلیم کر لیا تھا، اس لئے اس قصہ کو اب دہرانا نہیں چاہیے۔ لیکن یہ حضرات اس حقیقت کو سامنے نہیں لائے کہ مولانا مدنی (مرحوم) نے حضرت علامہؒ کی وفات کے قریب چھ ماہ بعد، ایک کتابچہ شائع کیا تھا جس میں کہا تھا کہ اقبالؒ کا موقف مبنی بر حقیقت نہیں تھا۔ اسلام کی رو سے قومیت کا معیار وطنیت ہے۔ طلوعِ اسلام نے اسی زمانہ میں اس کتابچہ کا بھرپور جواب شائع کیا تھا جس کا کسی سے آج تک جواب بن نہیں پڑا۔ (یہ مقالہ بارِ دیگر، طلوعِ اسلام بابت جولائی 1975ء میں شائع ہوا تھا)۔

☆ ☆ ☆

علامہ اقبالؒ عمر بھر اسلام کی اس بنیادی حقیقت کو پیش کرتے رہے، لیکن یہ احساس ان کے دل میں برابر کھٹک پیدا کر رہا تھا کہ ان کے بعد ہندوستان کی سیاست میں ان نظریات کو عملی طور پر کون آگے بڑھائے گا۔ جب آنے والا مؤرخ اس حقیقت پر نگاہ ڈالے گا کہ اس مقصد کے لئے ان کی نگہ انتخاب کہاں جا کر ٹکی تو وہ یقیناً محو حیرت رہ جائے گا۔ ان کی نگاہ کا ہدف تھا مسٹر محمد علی جناح۔ وہ جناح جو عمر بھر نیشنلسٹ رہا اور پھر ہندوستانی سیاست سے دل برداشتہ ہو کر لندن کے گوشۂ خلوت میں جا بیٹھا تھا۔ اس قسم کے نیشنلسٹ کو اسلامی قومیت کے نظریہ کا ایسا معتقد بنا دینا کہ وہ اسے اپنی زندگی کا مشن قرار دے لے اقبالؒ کا وہ کارنامہ ہے جس سے ملت اسلامیہ ان کی ہمیشہ رہینِ منت رہے گی۔ یہ کیسے ہوا تھا، اس حقیقت کی پردہ کشائی قائد اعظمؒ کے سوانح حیات کا انگریز مرتب (ہیکٹر بولیتھو) ان الفاظ میں کرتا ہے۔

> اپنے قیامِ لندن کے دوران مسٹر جناح نے اقبالؒ سے کئی ملاقاتیں کیں۔ وہ ایک دوسرے کے بہت اچھے دوست تھے۔ لیکن اس کے باوجود جناحؒ نے اقبالؒ کے دلائل کو فوری طور پر تسلیم نہیں کیا۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا۔ (صفحہ 99)

جناح انگلستان گیا تھا تو اس نیشنلزم کا پرستار جس کی شہادت آج بھی بمبئی میں "جناح کانگریس ہال" دے رہا ہے۔ اور واپس آیا تو اقبالؒ کا یہ پیغام دہراتا ہوا کہ

اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری
دامن دیں ہاتھ سے چھوٹا تو جمعیت کہاں
اور جمعیت ہوئی رخصت تو ملت بھی گئی

قائد اعظمؒ نے اسلام کے اس تصورِ قومیت کو کس کس انداز سے پیش کیا' اس کی مثالیں آگے چل کر آئیں گی۔ لیکن میں سب سے پہلے ان کا ایک ایسا تبصرہ پیش کر دینا مناسب سمجھتا ہوں جس میں انہوں نے پوری تفصیل کو اس طرح سمٹا کر رکھ دیا ہے جیسے آنکھ کے تل میں آسمان۔ انہوں نے 8 مارچ 1944ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا۔

> پاکستان کا آغاز اُس دن سے ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب یہاں ہنوز مسلمانوں کی حکومت بھی قائم نہیں ہوئی تھی۔

بات کس قدر واضح ہے کہ جب یہاں پہلی بار ایک غیر مسلم' اسلام لے آیا تو اس ملک میں دو قوموں کا وجود عمل میں آ گیا اور یہی پاکستان کی بنیاد ہے۔

انہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے بنیادی اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے' ایڈورڈز کالج، پشاور میں 27 نومبر 1945ء کو کہا تھا۔

ہم دونوں قوموں میں صرف مذہب کا فرق نہیں۔ ہمارا کلچر ایک دوسرے سے الگ ہے۔ ہمارا دین، ہمیں ایک ایسا ضابطۂ حیات دیتا ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں میں ہماری راہ نمائی کرتا ہے۔ ہم اس ضابطہ کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔

جداگانہ قومیت کا یہی وہ تصور تھا جس کی مخالفت ہندوؤں کی طرف سے اس شدّ ومد کے ساتھ ہوئی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے، آل انڈیا نیشنل کنونشن کے خطبۂ صدارت میں (مارچ 1937ء میں) کہا تھا کہ

ایسے لوگ ابھی تک زندہ ہیں جو ہندو، مسلمان کا ذکر اس طور پر کرتے ہیں گویا دو ملکوں اور قوموں کا بارے میں گفتگو ہے۔ جدید دنیا میں دقیانوسی خیال کی گنجائش نہیں۔

انہوں نے اپنی سوانحِ عمری میں لکھا تھا

مسلم قومیت کا تخیل صرف چند لوگوں کی من گھڑت اور محض پروازِ خیال ہے۔ اگر اخبارات اس کی اِس قدر اشاعت نہ کرتے تو بہت تھوڑے لوگ اس سے واقف ہوتے۔

جب قائدِ اعظمؒ نے اس تصورِ قومیت پر بار بار زور دیا تو مسٹر گاندھی نے انہیں (مورخہ 15 ستمبر 1944ء کو) ایک خط لکھا۔

میں تاریخ میں اس کی مثال نہیں پاتا کہ کچھ لوگ جنہوں نے اپنے آباؤ اجداد کا مذہب چھوڑ کر ایک نیا مذہب قبول کر لیا ہو، وہ اور اُن کی اولاد یہ دعوٰی کریں کہ وہ اپنے آباؤ اجداد سے الگ قوم بن گئے ہیں۔ اگر ہندوستان اسلام کی آمد سے پہلے ایک قوم تھا تو اسلام کے بعد بھی اسے ایک قوم ہی رہنا چاہیے خواہ اس کے سپوتوں میں سے ایک کثیر تعداد نے اسلام قبول کر لیا ہو۔

مسٹر گاندھی کا یہ خط، یوں سمجھئے کہ قائدِ اعظمؒ کے اس خط کے جواب میں تھا جس میں انہوں نے، مسٹر گاندھی کو لکھا تھا کہ

اس باب میں مجھے نہ کسی قسم کا دھوکا ہے، نہ شک وشبہ، کہ نہ ہندوستان میں ایک قوم بستی ہے اور نہ ہی یہ ملک ایک ہے۔ یہ برِ صغیر اقوام کا مجموعہ ہے جس میں ہندو مسلمان دو بڑی بڑی قومیں ہیں۔ آج آپ اس سے انکار

کرتے ہیں کہ قومیت کی تشکیل میں مذہب ایک بہت بڑا عنصر ہے۔ لیکن آپ سے جب یہ سوال کیا گیا تھا کہ زندگی میں آپ کا مقصود کیا ہے اور وہ کون سی قوتِ محرکہ ہے جو ہمیں آمادہ بہ عمل کرتی ہے۔ کیا وہ مذہب ہے یا سیاست یا عمرانی اصطلاح ہے' تو آپ نے کہا تھا کہ وہ خالص مذہبی جذبہ ہے۔۔۔(لہٰذا مذہب اور سیاست دو الگ الگ شعبے نہیں ہیں) آج انسانی سعی و کاوش کا دائرہ ایک ناقابلِ تقسیم وحدت بن چکا ہے۔ آپ تمدنی' سیاسی' معاشی اور خالص مذہبی امور کہ الگ الگ شعبوں میں تقسیم کر ہی نہیں سکتے۔ جس مذہب کہ نوعِ انسانی کے معاملات سے واسطہ نہیں میں اسے مذہب ہی تسلیم نہیں کرتا۔ مذہب انسان کے ہر معاملہ کے لئے اخلاقی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ اگر مذہب نہ ہو تو انسانی اعمال اس بنیاد سے محروم رہ جاتے ہیں، اور جب زندگی اس بنیاد سے محروم رہ جائے تو وہ انسانی زندگی نہیں محض غوغہ آرائی اور ہنگامہ پروری بن کر رہ جاتی ہے جس میں شور و شغب تو بہت ہوتا ہے لیکن مقصد کچھ نہیں ہوتا۔

(جناحؒ کا خط بنام گاندھی۔ جنوری 1940ء)

مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس 1940ء تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں نشانِ منزل کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ اس میں پاکستان کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا۔ اس اجلاس کے خطبۂ صدارت میں قائدِ اعظمؒ نے فرمایا تھا۔

میرے لئے یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ آخر ہمارے ہندو بھائی' اسلام اور ہندومت کی حقیقت اور اہمیت کو سمجھنے سے کیوں گریز کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں "مذہب" نہیں بلکہ ایک دوسرے سے مختلف معاشرتی نظام ہیں اور اس بنا پر متحدہ قومیت کا تخیل ایک ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ یاد رکھئے' ہندو اور مسلمان' مذہب کے ہر معاملہ میں دو جداگانہ فلسفے رکھتے ہیں۔ دونوں کی معاشرت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ دونوں الگ الگ تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں جن کی بنیادیں متضاد تصورات پر ہیں۔ دو ایسی قوموں کو ایک نظامِ مملکت میں یکجا کر دینا باہمی مناقشت کو بڑھائے گا اور بالآخر اس نظام کو پاش پاش کر دے گا جو اس ملک کی حکومت کے لئے وضع کیا گیا ہو۔

اس کے ایک سال بعد انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس مدراس' کے خطبۂ صدارت میں اپنے اس دعویٰ کا اعادہ کرتے ہوئے فرمایا۔

> مسلم لیگ کے نصب العین کا یہ بنیادی اصول ہے کہ ہندوستان کے مسلمان ایک جداگانہ قومیت رکھتے ہیں۔ انہیں کسی دوسری قوم میں جذب کرنے یا ان کے نظریات یا ملی تشخص کو مٹانے کے لئے جو کوشش بھی کی جائے گی، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ اپنے جداگانہ قومی تشخص اور جداگانہ حکومت کو قائم کر کے رہیں گے۔

قائدِ اعظمؒ نے اس دعویٰ کو اس شدّ و مد سے دہرایا کہ ان کے مخالفین تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا کہ اس حقیقت کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں۔ چنانچہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ایک ممتاز رکن 'مسٹر این' سی دت نے اپنے ابنائے قوم کے نام ایک کھلی چٹھی میں، جو اخبار مدینہ 'بجنور کی یکم فروری 1940ء کی اشاعت میں شائع ہوئی تھی' لکھا تھا۔

> ان حالات میں 'میرا خیال ہے کہ ہندہ مسلم قضیہ کا حل یہی ہو گا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمانوں کو دو قومیں سمجھ لیا جائے اور پھر دو قوموں کی حیثیت سے ان کے متعلق ایک متحدہ قومیت کا خیال ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دل سے نکال دیا جائے۔ مسٹر جناحؒ نے حال ہی میں گاندھی جی کو جواب دیتے ہوئے متحدہ قومیت کے تصور کو سراب کے لفظ سے تعبیر کر کے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔ یہ میرے خیال میں 'اب نہیں' تو کل حقیقت ہو کر رہے گا..... میرا خیال ہے کہ اب ہمیں پاکستان کے خیال سے ڈرنا نہیں چاہیے۔ البتہ اس میں ترمیم و اصلاح کر کے 'اسے اپنے حسبِ حال بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اور اس حقیقت کو' بالآخر' ہندو اور انگریز دونوں کو تسلیم کرنا پڑا اور قومی نظریہ کی بناء پر پاکستان وجود میں آ گیا۔ اس موضوع پر قائدِ اعظمؒ کی تقاریر اور بیانات سے اور بھی بہت کچھ پیش کیا جا سکتا ہے لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ انہی اقتباسات سے واضح ہو گیا ہو گا کہ دو قومی نظریہ کے متعلق ان کے خیالات اس قدر صاف اور واضح تھے کہ اس باب میں کسی شک و

شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد بھی وہ کس طرح اس حقیقت کو دہراتے رہے، اسے ذرا آگے چل کر پیش کیا جائے گا۔

میں نے اپنے مقالہ (مندرجہ نوائے وقت مورخہ 17 اکتوبر 1980ء) میں کہا تھا کہ تقسیمِ ہند اور تشکیلِ پاکستان کے مخالفین' قائدِ اعظمؒ کی 11 اگست 1947ء کی تقریر کو ٹرُپ کے پتے کے طور پر استعمال کرتے ہیں' اور کہتے ہیں کہ قائدِ اعظمؒ نہ تو اسلامی مملکت کے قائل تھے اور نہ ہی مسلمانوں کی الگ قومیت کے موئد وہ وطن کی بنیادوں پر متحدہ قومیت کے قائل تھے۔ میں نے اپنے اس مضمون میں (محولہ بالا تقریر کے ضمن میں) اسلامی مملکت کے مسئلہ پر تو وضاحت سے بحث کی تھی' لیکن نظریہ' قومیت کے سلسلے میں صرف اتنا کہا تھا کہ اس سے ان کی مرادیہ نہیں تھی کہ "مسلمان اور غیر مسلم" اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن جائیں گے۔ انہوں نے کہا یہ تھا کہ غیر مسلم یہاں اقلیت کی حیثیت سے رہیں گے اور اسی حیثیت سے ان کے حقوق کی حفاظت کی جائے گی۔ اس نکتہ کی وضاحت ضروری ہے۔

غیر مسلم اقلیتیں

انہوں نے (11 اگست 1947ء کی محولہ بالا تقریر سے قریب ایک ماہ پہلے) 13 جولائی 1947ء کو نامزد گورنر جنرل کی حیثیت سے دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کیا تھا۔ اس میں ان سے جب پاکستان میں اقلیتوں کے بارے میں سوال کیا گیا تو انہوں نے فرمایا۔

> میں ان وعدوں سے جو میں نے بارہا اقلیتوں کے بارے میں کئے ہیں' منحرف نہیں ہوں گا۔ میں نے بار بار اقلیتوں کے بارے میں کہا ہے کہ انہیں پورا پورا تحفظ حاصل ہو گا۔ میں جو بھی کہتا ہوں' اس کا وہی مفہوم ہوتا ہے اور جو کچھ میں کہہ چکا ہوں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اقلیتوں کو خواہ وہ کسی جماعت اور کسی فرقے سے متعلق ہوں بہر طور پوری طرح تحفظ دیا جائے گا۔ ان کو اپنی مذہبی رسومات وعبادات کی پوری آزادی ہو گی۔ اس میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی ان کی جان، ان کے مال اور ان کے تمدن کی پوری حفاظت کی جائے گی

اور انہیں بلا تفریقِ مذہب وملت ورنگ ہر صورت میں پاکستان کا باشندہ تصور کیا جائے گا۔

(بحوالہ نوائے وقت مورخہ 19 جنوری 1978ء)

11 اگست کے بعد

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ نے اس میں' پاکستان کے غیر مسلموں کو اقلیتیں کہہ کر پکارا ہے۔ یہ ان کی 11 اگست کی تقریر سے ایک ماہ پہلے کی بات ہے اس کے بعد انہوں نے (اس تقریر کے تین ہی دن بعد) 14 اگست کو مجلسِ آئین ساز کا افتتاح کیا۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی تقریر میں یہ کہہ دیا تھا کہ مجھے امید ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اقلیتوں سے ویسا ہی کشادہ ظرفی اور رواداری کا سلوک کیا جائے گا جیسا شہنشاہ اکبر نے کیا تھا۔ قائدِ اعظمؒ نے ماؤنٹ بیٹن کے اس مشورہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا۔

> شہنشاہ اکبر نے غیر مسلموں کے ساتھ جس مذہبی رواداری اور حسنِ سلوک کا ثبوت دیا' وہ ہمارے ہاں کوئی بعد کا وضع کردہ مسلک نہیں تھا۔ وہ مسلک ہمارے ہاں تیرہ سو سال پہلے سے چلا آرہا تھا جب حضور نبی اکرمؐ نے یہودیوں اور عیسائیوں پر فتح حاصل کرلینے کے بعد ان سے لفظاً ہی نہیں بلکہ عملاً رواداری برتی اور ان کے مذہب اور عقائد کو عزت و احترام کی نظروں سے دیکھا۔ مسلمانوں کی تمام تاریخ اس کی شاہد ہے کہ انہوں نے جہاں جہاں بھی حکومت کی (غیر مسلموں کے ساتھ رواداری اور حسنِ سلوک کے) انہی عظیم انسانیت ساز اصولوں پر عمل کیا اور انہی پر ہمیں بھی عمل کرنا چاہیے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے کس طرح اس حقیقت کہ واضح کر دیا کہ پاکستان میں غیر مسلموں کی حیثیت کیا ہو گی؟ اس ضمن میں آپ اس نکتہ پر بھی غور فرمایئے کہ حضور نبی اکرمؐ نے جن یہودیوں اور عیسائیوں سے حسنِ سلوک کا برتاؤ کیا تھا' وہ مسلم قوم کا جزو نہیں بن گئے تھے۔ اسلامی مملکت میں ان کی حیثیت ذِمّیوں کی تھی۔ یہ حقیقت بجائے خویش اسلامی نقطۂ نگاہ سے ''دو قومی نظریہ'' کا بین ثبوت ہے۔

اس کے بعد قائدِ اعظمؒ قریب ایک سال زندہ رہے اور اس دوران انہوں نے بہت سے مواقع پر تقاریر کیں اور بیانات دیئے۔ جہاں جہاں بھی موقع ملا انہوں نے غیر مسلموں کہ ہمیشہ اقلیت کہہ کر پکارا اور انہیں یقین دلایا کہ یہاں ان سے رواداری کا برتاؤ کیا جائے گا۔ مثلاً انہوں نے 11 اکتوبر 1947ء کو خالق دینا ہال کراچی میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> ایک اور سوال جو میرے دل میں بار بار اُبھرتا ہے' اقلیتوں کا مسئلہ ہے۔ میں نے جلوت اور خلوت میں بار بار اس امر پر زور دیا ہے کہ ہمیں اقلیتوں سے حسنِ سلوک کا ثبوت دینا چاہیے۔ تقسیمِ ہند کے وقت اس امر کی ضمانت دی گئی تھی کہ ہندوستان اور پاکستان دونوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا۔ لہٰذا جب تک اقلیتیں مملکت کی وفادار رہیں گی' انہیں یہاں کسی قسم کا خطرہ نہیں ہو گا۔

پھر انہوں نے 30 اکتوبر کو یونیورسٹی سٹیڈیم لاہور میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

> اسلام ہر مسلمان کا فریضہ قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے ہمسایوں اور اقلیتوں کی پوری پوری حفاظت کرے۔ خواہ ان کا عقیدہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے اس کے باوجود ہمیں یہاں کی اقلیتوں کا پورا پورا تحفظ کرنا چاہیے اور ان کے دل میں اس حفاظت کی طرف سے کامل اعتماد پیدا کرنا چاہیے۔ ہمارا یہی رویہ ہمارے لئے باعثِ عزت اور وجہٗ افتخار ہونا چاہیے۔

3 فروری 1948ء کو سندھ کے پارسیوں نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ۔

> حکومت اس امر کا خاص اہتمام کر رہی ہے کہ اقلیتوں کے دل سے 'خوف اور بد اعتمادی کے تمام شبہات کا ازالہ کر دے۔'

انہوں نے 19 فروری 1948ء کو آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے براڈ کاسٹ میں کہا۔

> اسلام ہم سے تقاضا کرتا ہے کہ ہم دوسرے اہلِ مذہب کے ساتھ رواداری کا ثبوت دیں۔ جو لوگ بھی یہاں برضا و رغبت ہم سے تعاون کریں گے ہم ان کے اس تعاون کا گرم جوشی سے استقبال کریں گے۔

انہوں نے 21 مارچ 1948ء کو ڈھاکہ کے ایک جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

> ہر غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہم نے اپنی انتہائی مشکلات کے اس زمانے میں' اپنی اقلیتوں کی جس قدر حفاظت کی ہے اور ان کا جتنا خیال رکھا ہے ہندوستان میں اس کی کہیں مثال نہیں ملتی۔ میں اس موقع پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان کی اقلیتوں کے ساتھ منصفانہ سلوک کریں گے۔ پاکستان میں ان کی جان اور مال کی حفاظت، ہندوستانی اقلیتوں کی مقابلے میں کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ پاکستان کے ہر شہری کی جان و مال کی حفاظت ہمارا ذمہ ہے اور ہم اس ذمہ داری کو مذہب و ملت کی تمیز سے بلند ہو کر پورا کرتے رہیں گے۔

اس کے بعد انہوں نے' اسی تقریر کے دوران فرمایا۔

> اسلام نے ہمیں یہ سکھایا ہے۔۔۔ اور آپ مجھ سے متفق ہوں گے (کہ یہ ایک عظیم سبق ہے جو اس نے ہمیں سکھایا ہے) کہ آپ کچھ بھی ہوں' اول و آخر آپ مسلمان ہیں اور ایک قوم کے افراد ہیں۔ تم نے اپنے لئے ایک وسیع مملکت تراشی ہے۔ یہ مملکت آپ سب کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ نہ پنجابی کی ہے نہ بنگالی کی۔ نہ سندھی کی ہے نہ پٹھان کی۔ یہ آپ سب کی ہے۔۔۔ اس لئے اگر تم ایک قوم بننا چاہتے ہو تو خدا کے لئے صوبائی تفریق کے خیال کو جھٹک دیجئے۔ صوبائی تفریق ایک لعنت ہے۔ ویسی ہی لعنت فرقہ بندی۔ شیعہ و سنی کی تفریق ہے۔

اس کے ساتھ ہی انہوں نے فرمایا۔

> میں اس موقعہ پر ایک بار پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان میں اقلیتوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے۔

آپ نے دیکھا کہ اس تقریر کے پہلے اقتباس میں انہوں نے مسلمانوں سے خطاب کرتے ہوئے انہیں ''ایک قوم'' کہا ہے اور دوسرے اقتباس میں' غیر مسلموں کو اقلیتیں۔۔۔ فرمایئے کہ ایسا کہنے والا ''دو قومی نظریہ'' کا علمبردار تھا' یا متحدہ قومیت کا؟

انہوں نے 26 مارچ 1948ء کو چٹا گانگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ

> ایک غیر جانبدار مبصر اس سے اتفاق کرے گا کہ ہندوستان کے مقابلے میں پاکستان نے اپنی اقلیتوں کے ساتھ کہیں بہتر سلوک کیا ہے۔ وہ یہاں ہمارے درمیان نہ صرف امن و اطمینان سے رہ رہی ہیں بلکہ انہیں اپنے قدم جمانے کی بھی پوری پوری آزادی حاصل ہے۔

13 جون 1948ء کو کوئٹہ کے پارسیوں کے ایک وفد نے قائدِ اعظمؒ کی خدمت میں استقبالیہ پیش کیا تو اس کے جواب میں آپ نے فرمایا کہ

> آپ کہ معلوم ہے کہ میری اور میری حکومت کی یہ پالیسی ہے کہ پاکستان میں بلا تمیز مذہب و ملت اور بلا لحاظِ رنگ و نسل ہر شخص کی جان، مال اور عزت کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی۔ اقلیتوں کو اس باب میں بالکل مطمئن رہنا چاہیے۔

آپ نے دیکھا کہ قائدِ اعظمؒ اس تمام دوران میں پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو اقلیت کہہ کر پکارتے رہے اور انہیں ان کی جان' مال اور عزت' آبرو کی حفاظت کا یقین دلاتے رہے۔ انہوں نے کہیں ایک بار بھی یہ نہیں کہا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم دونوں مل کر ایک قوم بن چکے ہیں' اس لئے اب ان میں کسی قسم کی تفریق و تمیز باقی نہیں رہی۔ اس کے برعکس وہ اس حقیقت کا اعادہ کرتے رہے کہ مسلمان اپنے مخصوص' نظریہ زندگی کی بناء پر ایک الگ قوم بنتے ہیں۔ انہوں نے 19 فروری 1948ء کو' آسٹریلیا کے باشندوں کے نام اپنے اس براڈکاسٹ میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے' کہا کہ

> یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل ہے۔ ہم محمد رسول اللہؐ کی تعلیم کے پیرو ہیں۔ ہم اس اسلامی برادری کے افراد ہیں جس میں حقوق' شرف و احترام اور تکریمِ ذات کے اعتبار سے تمام افراد برابر ہوتے ہیں۔ بنا بریں ہم میں وحدت اور اخوت کا بڑا گہرا اور خالص جذبہ ہے۔ ہماری اپنی تاریخ ہے اور اپنی رسوم و روایات' ہم اپنے نظریاتِ زندگی' نقطۂ نگاہ اور احساسِ دروں کے مالک ہیں جو قومیت کی تشکیل کا مدار بنتا ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قائدِ اعظمؒ نے قومیت کی تشکیل کے لئے کون کون سے اجزاء کو لاینفک قرار دیا؟ کیا یہ وہی اجزاء نہیں جن کے امتزاج سے مسلم قوم یا امتِ مسلمہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ قائدِ اعظمؒ نے کہیں بھی یہ کہا تھا کہ ہم (پاکستان کے مسلم اور غیر مسلم) اشتراکِ وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن چکے ہیں؟

انہوں نے 14 اگست 1948ء کو مملکتِ پاکستان کی پہلی سالگرہ کے موقع پر اپنے اس پیغام میں جو ان کی زندگی کا آخری پیغام تھا پاکستان کو ''دنیا کی سب سے بڑی مسلم سٹیٹ'' کہہ کر پکارا۔ یہ پہلا موقع نہیں تھا کہ انہوں نے اسے ''مسلم سٹیٹ'' کہا ہو اس سے پہلے بھی انہوں نے اسے ہر موقع پر مسلم سٹیٹ ہی قرار دیا تھا۔

ہم پوچھتے ہیں دینا بھر کے ماہرینِ سیاست سے کہ جو مملکت محض وطنیت کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہو' اسے کبھی بھی مسلم سٹیٹ' ہندو سٹیٹ یا عیسائی سٹیٹ کہا جاسکتا ہے؟ یاد رہے کہ وطنیت کی بنیادوں پر مختلف آئیڈیالوجی رکھنے والوں کے امتزاج سے جو قوم متشکل ہوئی ہو' اس کی مملکت ہمیشہ سیکولر ہوتی ہے۔

مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) کے ساتھ اس بحث کے سلسلے میں جس کا ذکر پہلے آچکا ہے' علامہ اقبالؒ نے فرمایا کہ

> اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کہ انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہو گا، اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پرواہی۔

لہٰذا قائدِ اعظمؒ کا مملکتِ پاکستان کو مسلم سٹیٹ کہنا خود اس امر کی شہادت ہے کہ وہ متحدہ قومیت کے قائل نہیں تھے۔

نئ نسل کی تعلیم

یہ تھے دو قومی نظریہ کے متعلق قائدِ اعظمؒ کے خیالات۔ میں نے تشکیلِ پاکستان کے فوری بعد' ملک کے اربابِ حل و عقد کی خدمت میں گذارش کیا تھا کہ مذہب (دین) کی بنیادوں پر ایک مملکت اور ایک جداگانہ قومیت کا تصور دینا رائج نظریاتِ سیاست کے خلاف، اور انوکھے نظریات ہیں۔ ہم (پرانی نسل کے افراد) تو وہاں سے یہ کچھ پکارتے ہوئے یہاں آگئے ہیں' لیکن ہماری نئ

نسل کی سمجھ میں یہ بات از خود نہیں آسکے گی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان کی تعلیم کا انتظام ایسا کیا جائے کہ یہ نظریات علیٰ وجہ البصیرت ان کی زندگی کا جزو بن جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ عام نظریاتِ سیاست سے متاثر ہو کر' سیکولر سٹیٹ اور وطنی قومیت کا قائل ہو جائے گا' اور اس سے پاکستان کی جداگانہ مملکت کی وجہ ٔجواز ہی ختم ہو جائے گی۔ ان حضرات نے میری ان گذاراشات پر کوئی توجہ نہ دی۔ نتیجہ یہ کہ یہ زہر ہماری نئی نسل کے رگ وپے میں سرایت کر گیا۔ ملک میں موجود پاکستان دشمن عناصر اس زہر آلودہ خون کی گردش کو تیز سے تیز تر کرتے چلے گئے اور اس کا عملی مظاہرہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی شکل میں ہوا۔ تعلیم کی طرف سے ہماری مجرمانہ تغافل شعاری کی وجہ سے وہاں کے طالب علموں کی ذہنیت کیا بن چکی تھی' اس کا اندازہ ڈھاکہ یونیورسٹی کے (اس زمانے کے) ایم اے فائنل کے ایک طالبِ علم عزیز الرحمٰن کے اس خط سے لگ سکتا ہے جو روزنامہ (Dainic Pakistan) کی اشاعت بابت 7 مئی 1969ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں اس نے لکھا تھا کہ ہم سے جو کہا جاتا ہے کہ ہم' مذہب کی بناء پر ہندوؤں سے الگ قوم ہیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے۔ کہ

> ہم شری چیتیا' خودی رام' سبھاش بوس' بیجائے سنگھ جیسے اپنی قومی ہیروز کو فراموش کر بیٹھے' اور ان کی جگہ خالد' طارق' موسیٰ اور علیؓ جیسوں کو اپنا ہیرو سمجھنے لگ گئے۔ ہم نے اپنے دیس کے بھگوان کو بھلا دیا' اور اس کی جگہ ایک غیر ملکی خدا' یعنی اللہ کو اپنا معبود تصور کر لیا۔ ہم اپنے بچوں کے نام اپنی زبان کے بجائے ایک اجنبی زبان میں رکھنے میں خوشی محسوس کرنے لگے۔ ہم نوراللہ اور خلیل اللہ جیسے ناموں پر ریجھ گئے اور ناگنی' کھاگنی جیسے سیدھے سادھے ناموں کو تیاگ دیا۔

اس کے بعد اس نے لکھا تھا۔

> اب ہمارا بنگالی جذبہ آہستہ آہستہ بیدار ہوتا چلا جا رہا ہے۔ اس اسلامی قومیت کے بند ڈھیلے پڑ جائیں گے اور علاقائی قومیت کے رشتے مضبوط ہوتے جائیں گے۔ مغربی پاکستان میں ہمارے سندھی بھائی سبھی بیدار ہو رہے ہیں۔ انہوں نے بھی یہ سمجھنا سیکھ لیا ہے کہ ہم راجہ داہر کی اولاد ہیں اور پہلے سندھی اور اس کے بعد کچھ اور ہیں۔

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب اور وجوہات معلوم کرنے کے لئے ہم تحقیقاتی کمیشن بٹھاتے رہے، لیکن یہ سب بے سود تھا۔ اس کا بنیادی سبب وہ ذہنیت تھی جس کی جھلک، عزیزالرحمٰن کے مندرجہ بالا خط میں صاف نظر آ رہی ہے۔ 1971ء کی جنگ کے بعد، سقوطِ ڈھاکہ کے جگر خراش المیہ پر شادیانے بجاتے ہوئے بنگلہ دیش کے اس وقت کے قائم مقام صدر، مسٹر نذر الاسلام نے اعلان فرمایا تھا کہ

> ہماری یہ فتح نہ کسی فوج کی فتح ہے، نہ کسی ملک کی، یہ فتح ہے حق کی باطل پر، یہ فتح ہے، ایک صحیح نظریہ کی غلط نظریہ پر۔ تقسیمِ ہند سے پہلے سر پھرے مسلمانوں نے یہ دعویٰ کیا کہ قومیت کا مدار مذہب کا اشتراک ہے، وطن کا اشتراک نہیں اور حکومت کی بنیاد مذہب پر ہے، سیکولر نہیں۔ وہاں ان لوگوں کو لاکھ سمجھایا گیا کہ یہ نظریہ غلط ہے اور ناممکن العمل، اس پر اصرار نہ کرو۔ لیکن وہ نہ مانے اور اپنے غلط مفروضہ کی بنیاد پر ایک جداگانہ قوم بن کر ایک الگ مملکت کے بانی بن گئے۔ لیکن چوبیس سالہ تجربے نے ثابت کر دیا کہ جو نظریہ یہ لوگ پیش کر رہے تھے وہ باطل تھا اور حق وہی تھا جو ان کے مخالفین پیش کر رہے تھے۔ سقوطِ ڈھاکہ نے اس حقیقت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ اب یہ شہادت تاریخ کے صفحات پر ہمیشہ کے لئے منقوش رہے گی۔ ہم ان راہ گم کردہ لوگوں سے اب بھی کہیں گے کہ وہ اس باطل نظریہ کو ترک کر کے وطن کے اشتراک کی بناء پر پھر سے ہندوستانی قوم کا جزو بن جائیں اور مذہب کو سیاست میں گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ جو حشر مشرقی پاکستان کا ہوا ہے، وہی کل مغربی پاکستان کا بھی ہو گا۔ حقائق کسی کے جھٹلائے جھوٹے ثابت نہیں ہو جایا کرتے۔

مسز اندرا گاندھی

ادھر نذرالاسلام صاحب یہ کہہ رہے تھے اور دوسری طرف (اس زمانہ کی بھارت کی وزیر اعظم) مسز اندرا گاندھی اپنی پارلیمان میں جشن ''فتحِ بنگالہ'' پر ہدیہ تبریک کے جواب میں یہ فرما رہی تھیں کہ۔

> یہ کامیابی نہ ہماری فوجوں کی کامیابی ہے اور نہ ہی حکومت کی کامیابی، یہ کامیابی ہے حق پر مبنی نظریہ کی، اس نظریہ کے خلاف جو باطل پر مبنی تھا۔ مسلمانوں نے تحریکِ پاکستان کی بنیاد ایک باطل نظریہ پر رکھی تھی۔ ہم انہیں بار

بار سمجھاتے رہے کہ ان کا نظریہ غلط ہے' یہ کامیاب نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے نہ مانا اور اپنی ضد پر قائم رہے۔ اب 25 سال کے تجربہ نے بتا دیا کہ جو کچھ ہم کہتے تھے' وہ حق تھا اور ان کا نظریہ باطل۔ یہ ان کے باطل نظریہ کی شکست ہے۔

(سابقہ مشرقی پاکستان) حالیہ بنگلہ دیش میں اس ذہنیت نے ملک کو دولخت کر دیا۔ ادھر مغربی پاکستان میں اس ذہنیت کی پرورش کے لئے دوسرا انداز اختیار کیا گیا۔ یہاں کہا گیا کہ مغربی پاکستان میں ایک قوم نہیں بلکہ مختلف قومیں آباد ہیں۔

قارئین کو شاید یاد ہو گا کہ 1968ء میں کراچی کی ''عوامی ادبی'' انجمن کی طرف سے ایک پمفلٹ شائع ہوا تھا جس پر منجملہ دیگر ''دانشورانِ قوم'' جوش ملیح آبادی اور فیض احمد فیض کے دستخط ثبت تھے۔ اس پمفلٹ میں کہا گیا تھا۔

> ہمارے نزدیک جمہوری آزادی میں قوموں کی ترقی کا مسئلہ بھی شامل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ملک میں جو مختلف قوموں کا وطن ہے وہ حالات پیدا کئے جائیں کہ سب قومیں' ان کی زبانیں اور تہذیبیں کسی ایک قوم کی اثر وتسلط سے آزاد ہو کر خود مختارانہ ترقی کر سکیں۔ ہمارے نزدیک پاکستان کی تمام قومیں مساوی حقوق کی مالک ہیں۔

یعنی سیکولر مملکتوں میں وطن کی چار دیواری کے اندر بسنے والے تمام افراد ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہاں ان حضرات نے اس نظریہ کی ترویج شروع کی کہ پاکستان کے مختلف صوبوں میں بسنے والے الگ الگ قوم ہیں۔ یعنی یہ ''اربابِ دانش'' سیکولر سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے ! ادھر تقسیمِ ہند کے سب سے شدید مخالف خان عبدالجبار خان بھی اس قسم کے نظریات عام کرنے میں برابر مصروف ہیں۔ انہوں نے 1973ء میں ''ٹائمز آف انڈیا'' کے نمائندے 'مسٹر دلیپ کمار مکر جی کو انٹرویو دیتے ہوئے فرمایا تھا کہ

> ''چند سال پہلے کا پاکستان اب مر چکا ہے۔ مغربی پاکستان میں چار قومیتوں کے درمیان رشتہ کے لئے اسلام کافی نہیں رہے گا۔ اس کے لئے سیکولر بنیادوں پر رشتے کی تعمیر کرنی ہو گی۔''

انہوں نے یہ بات کوئی پہلی مرتبہ نہیں کہی۔ وہ جب 1969ء میں کابل سے بھارت گئے تھے تو انہوں نے وہاں کہا تھا کہ

میں نے دو قومی نظریہ کبھی تسلیم کیا نہ ہی کبھی ایسا کروں گا۔ مذہب قومیت کا معیار کس طرح ہو سکتا ہے؟ میں افغانستان کے باشندوں کو بھی کہتا رہا ہوں اور دوسرے لوگوں کو بھی کہ اسلام دنیا میں انسان کے بعد آیا ہے۔ جب اسلام یا کوئی اور مذہب دنیا میں نہیں آیا تھا اس وقت بھی تو یہاں انسان بستے تھے۔ ان کی کوئی نہ کوئی قومیت تو تھی ہی' لہٰذا میں اسے کس طرح تسلیم کرلوں کہ قومیت کا معیار مذہب ہو سکتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ہماری اکثر مشکلات کا سبب یہ ہے کہ مذہب کو قومیت کے ساتھ ملا دیتے ہیں۔

(سٹیٹس مین 16 اکتوبر 1969ء بحوالہ پاکستان ٹائمز 19 مارچ 1973ء)

ادھر والدِ بزرگوار یہ فرما رہے تھے اور ادھر ان کے صاحبزادے خان عبدالولی خان یہ اعلان کر رہے تھے۔

دو قومی نظریہ ختم ہو چکا ہے اسلام کی باتیں ڈیڑھ ہزار سال پرانی اور فرسودہ ہیں۔ پچیّس سال کے تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ نظریۂ پاکستان غلط تھا۔

(نوائے وقت 13 اکتوبر 1972ء)

میں نے پہلے لکھا ہے کہ بنگالی طالبِ علم' عزیز الرحمٰن نے اپنے خط میں کہا تھا کہ اب وطن پرستی کی ذہنیت مشرقی پاکستان سے آگے بڑھ کر سندھ میں سرائیت کر رہی ہے۔ کراچی سے شائع ہونے والے روزنامہ ''حریت'' کی اشاعت بابت 4 نومبر 1968ء میں ایک سندھی طالبہ مس نسیم تھل کا ایک خط چھپا جس میں اس نے کہا تھا کہ

وہ اسلام اور پاکستان' جو ہم سے ہمارا سندھ اور سندھی زبان چھینے' ایسے اسلام اور پاکستان کو ہم اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں۔ یہ جھوٹ ہے کہ سندھ صرف اسلام اور اسلامی فلسفہ کی وجہ سے عظیم ہے۔ سندھ کی عظمت' سندھ کے سادہ لوح بہادر عوام ہیں۔ سندھ موہنجوڈارو' کوٹ ڈی جان کے آثارِ قدیمہ اور لطیف' سچل' ایاز' جی ایم سید کی طرح کے شاعروں اور دانشوروں کی وجہ سے عظیم ہے۔ وہ اپنی تہذیب کی وجہ سے عظیم ہے۔ (نہ کہ اسلام کی وجہ سے)۔

(طلوعِ اسلام دسمبر 1968ء)

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے بعد وہاں کے بہاری (یعنی غیر بنگالی) مسلمانوں پر جو قیامت ٹوٹی (اور ان پر مصائب وآلام کا جو سلسلہ ابھی تک جاری ہے) اس پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے سندھ کی ایک اور بیٹی' غزالہ بلوچ کا ایک خط اخبار "ڈیلی نیوز" کراچی کی 19 اگست 1972ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ جس میں اس نے لکھا تھا۔

> اگر مشرقی پاکستان کے بہاری، پاکستانی فوج اور مرکزی حکومت کے بجائے بنگالی علیحدگی پسندوں کی حمایت کرتے تو وہ آج بڑی پر مسرت حالت میں ہوتے لیکن انہوں نے سخت حماقت کی اور پاکستان۔۔۔ایک پاکستان کے ساتھ وفاداری پر اصرار کرتے رہے اور اب اپنی حماقت کی قیمت، اپنی اور اپنے بال بچوں کی جانوں کی شکل میں ادا کر رہے ہیں۔ بہاریوں کی بد قسمتی دراصل اس دن شروع ہوئی تھی جب انہوں نے 47-1946 میں پاکستان کے حق میں ووٹ دیا تھا۔ اگر بہاری مسلمان ہندوستان کے ہندوؤں کے اندر جذب ہو جاتے تو آج بہاری آرام اور چین سے زندگی کے دن گزار رہے ہوتے۔ ہندوؤں کے اندر جذب ہونے کے لئے انہیں صرف اس قدر کرنا پڑتا کہ اسلام چھوڑ کر ہندو دھرم اختیار کر لیتے۔ اگر وہ ایسا کر لیتے تو دو قومی نظریہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ ہندوستان میں ایک ہندو قوم ہوتی۔ اب بھی پاکستان میں رہنے والے مہاجرین کے سامنے دو راستے کھلے ہیں یا تو وہ ہندو دھرم اختیار کر کے ہندوستان واپس چلے جائیں اور وہاں ایک عظیم ترقی پذیر قوم کا جزو بن کر رہیں اور یا پاکستان میں سندھی بن کر رہیں جس کا مطلب یہ ہو گا کہ وہ ایک بہت چھوٹی سی قوم کا جزو بن جائیں گے۔

(طلوعِ اسلام اکتوبر 1972ء صفحہ نمبر 43)

وہاں کے نوجوان طبقہ میں یہ ذہنیت از خود پیدا نہیں ہو گئی تھی وہاں کے "بزرگ سیاستدانوں" نے جب اپنی گاڑی کا رخ بدلا تو اس سے ساری فضا متاثر ہو گئی۔ سندھ کی "بزرگ ترین سیاسی شخصیت" مسٹر جی ایم سید کی تھی۔ وہ مسٹر سید جنہوں نے سب سے پہلے

سندھ میں مسلم لیگ کو متعارف کرایا تھا اور بعد میں ان کی کیفیت یہ ہو گئی کہ اوائل 1972ء میں جب ان کی سالگرہ منائی گئی تو اس تقریب پر انہوں نے تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> پاکستان کے موجودہ انتشار' افراتفری اور پسماندگی میں چار عناصر کا ہاتھ ہے۔ یعنی دو قومی نظریہ' مذہبی نظامِ حکومت کا تخیل' فسطائی نظریۂ سیاست اور پڑوسی ملکوں سے دشمنی۔
>
> 24 سالہ تجربہ سے فائدہ اٹھا کر مسلمانوں کے دو قومی نظریہ کو خیر باد کہا جائے، یا پاکستان میں پانچ قوموں کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور بنگال کی آزادی کے بعد مغربی پاکستان کی چار قوموں کو ملکی خود مختاری دے کر ان کے باہمی سمجھوتے سے ایک فیڈریشن بنائی جائے۔

(المبر 4 فروری 1972ء)

سندھ سے آگے بڑھ کر بلوچستان کی طرف آیئے۔ وہاں کے (اس زمانے کے) وزیرِ اعلیٰ' سردار عطاءاللہ خان مینگل نے 1972ء میں کہا تھا کہ

> جس دو قومی نظریہ کی اساس پر پاکستان حاصل کی گیا تھا وہ خلیجِ بنگال میں غرق ہو چکا ہے۔

(نوائے وقت 18 اکتوبر 1972ء)

اور وہاں کے گورنر میر غوث بخش بزنجو نے ملتان کے ہوائی اڈے پر اخبار نویسوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا تھا

> پاکستان میں بسنے والی قومیتوں کی تاریخ' جغرافیائی حدود' تہذیب و ثقافت ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ ان کا معاشرہ جدا ہے۔ ہماری مطالبہ اتنا ہے کہ ان کے نازک احساسات کا خیال رکھا جائے۔

آپ سے سوال کیا گیا کہ پھر پاکستان کو متحدہ رکھنے کی کیا اساس ہے؟

انہوں نے کہا کہ چار قومیتوں کے مجموعہ سے ایک پاکستانی قوم بنے گی۔ جب ہم آپس میں بات کریں گے تو علیحدہ علیحدہ قومیتوں میں ہوں گے۔ جب کسی غیر ملک سے بات ہو گی تو پاکستانی قوم کی بات ہو گی۔

(نوائے وقت 14 اکتوبر 1972ء)

(کسی نے ان سے یہ نہ پوچھا کہ جب سارے ملک میں قومیں الگ الگ ہوں گی تو پاکستانی قوم کی بات کون کرے گا؟) میں اس سلسلہ میں بہت سی مثالیں پیش کر سکتا ہوں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میرے زیرِ نظر مقصد کے لئے سرِ دست اتنا ہی کافی ہے۔ (میں مزید تفاصیل کسی دوسرے وقت پر اُٹھائے رکھتا ہوں)۔

☆☆☆

اس وقت تک دو قومی نظریہ سے متعلق گفتگو پاکستان کے حوالے سے ہو رہی تھی لیکن جیسا کہ شروع میں کہا ہے یہ نظریہ نہ تو تحریکِ پاکستان کے کسی سیاسی محرکہ کی تخلیق تھا اور نہ ہی پاکستان یا کسی اور ملک سے وابستہ' یا اس تک محدود۔ یہ ایک ابدی حقیقت ہے جو کفر اور اسلام کی تفریق کے ساتھ وابستہ ہے۔ چونکہ اسلام میں قومیت کا معیار ایمان کا اشتراک ہے' اس لئے کوئی اہلِ ایمان' جہاں بھی ہے' وہ عظیم امتِ مسلمہ کا فرد ہے اور جغرافیائی بُعد اور مسافت اسے نہ اس امت سے الگ کر سکتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسری قوم کا جزو بنا سکتے ہیں۔ اسلام چھوڑنے کے بعد ہی کسی دوسری قوم کا جزو بن جا سکتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے جب دو قومی نظریہ کا تصور پیش کیا تو اسے صرف ہندی مسلمانوں تک محدود نہیں رکھا تھا۔ (پاکستان کا اس زمانے میں ابھی تک تصور بھی ذہنوں میں نہیں آیا تھا)۔ انہوں نے اس پیغام کو تمام دنیا کے مسلمانوں تک پھیلا دیا (مثلاً) انہوں نے 1922ء میں، پہلی جنگِ عظیم کے بعد، تمام مسلم ممالک کی بالعموم اور ترکی کی بالخصوص حالت بڑی سقیم ہو رہی تھی، جملہ عالمِ اسلام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ یاد رکھو ہماری نکبت و زبوں حالی کا ایک ہی علاج ہے، اور وہ یہ کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر!
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اُڑ گیا دنیا سے تو مانندِ خاکِ رہ گذر

اور اس سے اگلے سال (1923ء) میں انہوں نے اپنی مشہور نظم ' طلوعِ اسلام' میں انہی اقوام کہ مخاطب کر کے کہا تھا

ہوس نے کردیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا ' محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی ' وہ خراسانی ' یہ افغانی ' وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودِ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے!
تو اے مرغِ حرم ' اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

وہ عمر بھر اسی طرح وحدت امت کے اس پیغام کو عام کرتے رہے' اس لئے کہ وہ حقیقی اسلام کے داعی تھے اور اسلام اور وحدتِ امت لازم وملزوم ہیں لیکن مسلمانانِ عالم' جو حقیقی اسلام کو نظر انداز کر کے دنیا کی دوسری قوموں کی طرح جغرافیائی حدود میں بٹ کر مختلف قومیں بن چکے تھے' انہوں نے اس پیغام کا کوئی اثر نہ لیا۔

اس کے بعد علامہ اقبالؒ نے اس نظریئے کو عملی شکل دینے کے لئے اسے پاکستان کے خطۂ زمین تک سمٹایا اور اس کی ابتداء ہندوستان سے کی۔ انہوں نے اس خطۂ زمین کا تصور ہی اس لئے دیا تھا کہ اس میں اسلام کو اس کی حقیقی شکل میں عملاً نافذ کیا جا سکے۔ اس اعتبار سے اسلام' دو قومی نظریہ ' اور پاکستان ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے تھے۔ پاکستان وجود میں آ گیا' لیکن یہ دیکھ کر تأسف ہی

نہیں، صدمہ ہوتا ہے کہ اس میں حقیقی اسلام کا احیاء تو ایک طرف، ہم پاکستانی مسلمان بھی ایک امت نہیں بن سکے۔ ہم میں صوبائی تقسیم بدستور قائم ہے۔ یہ صوبائی تقسیم نہیں، درحقیقت نسلی تفریق ہے، اور وہ بھی اس قدر گہری کہ ایک ہی نسل کے ایک ہی صوبے میں بسنے والے پاکستانی مسلمان ہندوؤں کی طرح ذاتوں، برادریوں، گوتوں تک میں بٹے ہوئے ہیں، اور باہمی تفریق و تقسیم کے گروہوں کو مضبوط سے مضبوط تر کرتے چلے جارہے ہیں۔ ہم میں قدرِ مشترک صرف مسلمان کا لفظ ہے۔ اس سے زیادہ اس کا مفہوم کچھ نہیں۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں اگر ہم۔۔۔ دو قومی نظریہ کے الفاظ دہراتے رہیں تو اس کا عملی نتیجہ تو کچھ نہیں نکل سکے گا۔ لہٰذا، جہاں ہم ان لوگوں کی مخالفت کرتے ہیں جو دو قومی نظریہ کے مخالف ہیں، ہمیں ان لوگوں کی بھی اسی طرح مخالفت کرنی چاہیے جو لفظی طور پر تو دو قومی نظریہ کے قائل ہیں، لیکن عملاً ایک امت بننے کے لئے کوئی عملی قدم نہیں اُٹھاتے۔ اس وقت مسلمانانِ عالم کے لئے بالعموم اور پاکستانی مسلمانوں کے لئے بالخصوص مقدم ترین مسئلہ وحدتِ امت کی تشکیل کا ہے۔ جب تک یہ وحدت قائم نہیں ہوتی نہ مملکتی سطح پر ہمارا کوئی مسئلہ حل ہو سکتا ہے، اور نہ ہی بین المملکتی سطح پر۔